

- ۶۳ رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ
- ۶۴ رسول بحیثیت پیشوا و نمونہ تقلید
- ۶۵ رسول بحیثیت شارع
- ۶۶ رسول بحیثیت قاضی
- ۶۷ رسول بحیثیت حاکم و فرمانروا
- ۷۰ سنت کے ماخذ قانون ہونے پر امت کا اجماع
- ۷۰ (۱۲) رسول پاکؐ کے تشریعی اختیارات
- ۷۲ حضورؐ کے تشریعی کام کی نوعیت
- ۷۲ اس تشریعی کام کی چند مثالیں
- ۷۵ (۱۳) سنت اور اتباع سنت کا مفہوم
- ۷۶ (۱۴) رسول پاکؐ کس وحی کے اتباع پر مامور تھے اور ہم کس کے اتباع پر مامور ہیں۔
- ۷۹ (۱۵) مرکز سنت؟
- ۸۱ چند اصولی سوالات
- ۸۳ (۱۶) کیا حضورؐ صرف قرآن پینچنے کی حد تک نبی تھے؟
- ۸۵ (۱۷) حضورؐ کی اجتہاد کی لغزشوں سے غلط استدلال
- ۸۸ (۱۸) مہموم خطرات
- ۹۳ (۱۹) نفاذ راشدین پر بہتان
- ۹۹ (۲۰) کیا حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی؟
- ۱۰۶ **سنت کے متعلق چند مزید سوالات۔ بلند مراسلت سابقہ**
- ۱۰۶ ڈاکٹر صاحب کا خط
- ۱۰۹ جواب :
- ۱۱۶ وحی یرایمان کی وجہ

۱۱۳

ما انزل اللہ سے کیا چیز مراد ہے ؟

۱۱۴

سنت کہاں ہے ؟

۱۱۸

کیا سنت کی حفاظت بھی خدا نے کی ہے ؟

۱۲۰

وحی سے مراد کیا چیز ہے ؟

۱۲۲

محض تکرار سوال

۱۲۲

ایمان و کفر کا مدار

۱۲۳

کیا احکام سنت میں رد و بدل ہو سکتا ہے ؟

۱۲۳

آخری خط اور اس پر تبصرہ

۱۲۵

”بزم طلوع اسلام“ سے تعلق ؟

۱۲۷

کیا گشتی سوال نامہ کا مقصد علمی تحقیق تھا ؟

۱۲۸

کیا سنت رسول کے معنی و مفہوم میں علماء کے درمیان اختلاف ہے ؟

۱۲۹

تہمت بے جا

۱۳۰

کتابت کی غلطی اور جہالت کی غلطی

۱۳۱

”جواب نہیں ملا“ کی تکرار

۱۳۲

عبارتوں میں ثمرناک قطع و برید

۱۳۴

رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی

۱۳۶

تعیینات سنت میں فرق مراتب

۱۳۹

علمی تحقیق یا جھگڑا لڑپن ؟

۱۴۱

رسول کی دونوں حیثیتوں میں امتیاز کا اصول اور طریقہ

۱۴۳

وحی جلی اور وحی خفی کے ذرائع ثبوت ایک ہی ہیں

۱۴۵

دجل و فریب کا ایک اور نمونہ

۱۴۷

وحی کی اقسام اور دین میں ان کا مرتبہ و مقام

- ۱۴۹ روایات میں باہمی اختلاف کی حقیقت
- ۱۵۲ ختم نبوت یا ختم نبی ؟
- ۱۵۳ اُمت کا اختلاف زیادہ ترجزئیات میں ہے
- ۱۵۴ ایک سطحی مغالطہ
- ۱۵۵ سنت و اُمرہ اختلاف کو محدود کرتی ہے
- ۱۵۶ منکرینِ سنت اور منکرینِ ختم نبوت میں وجہِ مماثلت
- ۱۵۷ سنت کو اساسِ آئین بنانے پر اعتراض اور اس کا جواب
- ۱۶۰ کیا محض تحریری ریکارڈ ہی ذریعہ ہدایت ہو سکتا ہے ؟
- ۱۶۲ ایک اور دلچسپ مغالطہ
- ۱۶۳ شخصی قانون اور ملکی قانون میں تفریق کیوں ؟
- ۱۶۵ خلطِ مبحث
- ۱۶۶ سفید جھوٹ
- ۱۶۷ مقصد براری کے لیے عبارات کی قطع و برید
- ۱۶۸ حیثیتِ رسولؐ کے بارے میں فیصلہ کن بات سے گریز
- ۱۶۹ کیا کسی غیر نبی کو نبی کی تمام حیثیات حاصل ہو سکتی ہیں ؟
- ۱۷۱ اسلامی نظام کے ”امیر“ اور منکرینِ حدیث کے ”مرکزِ اُمت“ میں عظیم فرق
- ۱۷۲ عہدِ رسالت میں مشاورت کے حدود کیلئے ؟
- ۱۷۴ اذان کا طریقہ مشورے سے طے ہوا تھا یا الہام سے ؟
- ۱۷۶ حضورؐ کے تمام فیصلے سند و حجت ہیں یا نہیں ؟
- ۱۷۸ کج بحثی کی ایک دلچسپ مثال
- ۱۸۰ حضورؐ کے ذاتی خیال اور برہنہ سے وحی کی ہوئی بات میں واضح امتیاز تھا
- ۱۸۱ کیا صحابہ اس بات کے قائل تھے کہ رسولؐ کے جیسے جیسے جہاں جاسکتے ہیں ؟

- ۱۸۳ مسئلہ طلاق ثلاثہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلے کی اصل نوعیت
- ۱۸۴ متولفہ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے استدلال کی نوعیت
- ۱۸۵ کیا مفتوحہ اراضی کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ حکم رسولؐ کے خلاف تھا؟
- ۱۸۶ ایک اور غلط نظیر
- ۱۸۶ کیا قرآن کے معاشی احکام عبوری دور کے ایسے ہیں؟
- ۱۸۸ حضورؐ صرف شارح قرآن ہی ہیں یا شارع بھی؟
- ۱۹۲ کیا سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟
- ۱۹۲ کیا قرآن کے علاوہ بھی حضورؐ پر وحی آتی تھی؟
- ۱۹۳ بصیرت رسولؐ کے خدا داد ہونے کا مفہوم
- ۱۹۵ وحی کی اقسام از روئے قرآن
- ۱۹۷ وحی غیر منسوبہ ایمان ایمان بالرسول کا جز ہے
- ۲۰۰ کیا وحی غیر منسوبہ بھی جبریل ہی لاتے تھے؟
- ۲۰۱ کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہیں یا الگ الگ
- ۲۰۵ کتاب کے ساتھ میزان کے نزول کا مطلب
- ۲۰۷ ایک اور کج بحثی
- ۲۱۱ تحویل قبلہ والی آیت میں کونسا قبلہ مراد ہے؟
- ۲۱۳ نبیؐ پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام
- ۲۱۶ لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّسُلَ كَمَا مَطْلَب
- ۲۲۰ ”دروغ گویم بر روی تو“
- ۲۲۳ تَبَايُنُ الْعَلِيمِ الْخَبِيرِ كَمَا مَطْلَب
- ۲۲۵ حضرت زینبؓ کا نکاح اللہ کے حکم سے ہوا تھا یا نہیں؟
- ۲۲۰ بِإِذْنِ اللَّهِ سے مراد قاعدہ جہاد کا حکم ہے؟

- ۲۲۹ ایک اور خانہ ساز تاویل
 ۲۳۱ سوال از آسمان و جواب از ریماں
 ۲۳۳ وحی بلا الفاظ کی حقیقت و نوعیت
 ۲۳۵ سنت ثابتہ کو ماننے سے انکار اطاعت رسول سے انکار ہے

عدالت عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ۔ ترجمہ از ملک غلام علی خاں، ۲۲۱ تا ۲۷۷

- ۲۷۸ تبصرہ - از الزام لاء علی مودودی
- ۲۷۹ دو اصولی سوالات
- ۲۸۱ فقہ حنفی کی اصل حیثیت
- ۲۸۶ فاضل حج کے بنیادی تصورات
- ۲۸۹ تصورات مذکورہ پر تنقید
- ۲۹۱ اجتہاد کے چند نمونے
- ۲۹۲ تعدد و ازواج کے مسئلے میں فاضل حج کا اجتہاد
- ۲۹۲ اس اجتہاد کی پہلی غلطی
- ۲۹۳ دوسری غلطی
- ۲۹۴ تیسری غلطی
- ۲۹۶ چوتھی غلطی
- ۲۹۷ پانچویں غلطی
- ۳۰۰ دوسرا اجتہاد، حدیث مرقہ کے بارے میں
- ۳۰۰ تیسرا اجتہاد، حضانت کے مسئلے میں
- ۳۰۱ بنیادی غلطی
- ۳۰۲ سنت کے بارے میں فاضل حج کا نقطہ نظر

- ۳۰۲ سنت کے بارے میں اُمت کا رویہ
- ۳۰۳ فاضل حج کے نزدیک دین میں نبی کی حیثیت
- ۳۰۵ نبی کی اصل حیثیت از روئے قرآن
- ۳۰۹ کیا وحی صرف قرآن تک محدود ہے؟
- ۳۱۰ کیا حضورؐ اپنے خیالات کی پیروی کے لیے آزاد تھے؟
- ۳۱۱ حضورؐ کی سنت غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں؟
- ۳۱۲ اتباعِ رسولؐ کا حقیقی مفہوم
- ۳۱۴ کیا حضورؐ کی رہنمائی صرف اپنے زمانے کے لیے تھی؟
- ۳۱۶ خلفائے راشدین کے اتباعِ سنت کی وجہ
- ۳۱۷ امام ابوحنیفہؒ کا علمِ حدیث اور اتباعِ سنت
- ۳۲۰ فاضل حج کے نزدیک احادیث پر اعتماد نہ کرنے کے وجوہ
- ۳۲۳ وجوہ مذکورہ پر تنقید
- ۳۲۳ کیا جھوٹی حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بنی ہیں؟
- ۳۲۴ کیا جھوٹی حدیثیں حضورؐ کے زمانے میں ہی رواج پانے لگی تھیں؟
- ۳۲۵ حضرت عمرؓ نے کثرتِ روایت سے کیوں منع کیا؟
- ۳۲۶ امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کا اضافہ
- ۳۲۷ جھوٹی حدیثیں آخر گھڑی ہی کیوں گئیں؟
- ۳۲۸ استدلال کی تین غلط بنیادیں
- ۳۲۹ کتابتِ حدیث کی ابتدائی ممانعت اور اس کے وجوہ
- ۳۳۰ کتابتِ حدیث کی عام اجازت
- ۳۳۱ احادیث کو زبانی روایت کرنے کی ہمت افزائی بلکہ تاکید
- ۳۳۳ جھوٹی حدیث روایت کرنے پر سخت وعید

- ۳۳۴ سنتِ رسولؐ کے تحت ہونے کی صریح دلیل
- ۳۳۶ کیا قابلِ اعتماد صرف لکھی ہوئی چیز ہی ہوتی ہے ؟
- ۳۳۹ کیا احادیثِ دھانی سو برس تک گوشہٴ خمول میں پڑی رہیں ؟
- ۳۴۰ صحابہ کی روایتِ حدیث
- ۳۴۱ دورِ صحابہ سے امام بخاریؒ کے دور تک علمِ حدیث کی مسلسل تاریخ
- ۳۴۵ دوسری صدی ہجری کے جامعینِ حدیث
- ۳۴۶ احادیث میں اختلاف کی حقیقت
- ۳۴۸ کیا حافظہ سے نقل کی ہوئی روایات ناقابلِ اعتماد ہیں ؟
- ۳۴۹ احادیث کے محفوظ رہنے کی اصل علت
- ۳۵۰ احادیث کی صحت کا ایک اہم ثبوت
- ۳۵۱ چند احادیث پر فاضل حج کے اعتراضات
- ۳۵۲ بعض احادیث میں عربی مضامین کیوں ہیں ؟
- ۳۵۶ اعتراضات کا تفصیلی جائزہ
- ۳۶۰ دو مزید حدیثوں پر اعتراض
- ۳۶۱ ایک اور حدیث پر اعتراض
- ۳۶۲ سنت کے تحت نہ ہونے پر دو مزید دلیلیں
- ۳۶۴ کیا محدثین کو خود احادیث پر اعتماد نہ تھا ؟
- ۳۶۵ احادیث میں اجمال اور بے ربطی کی شکایت
- ۳۶۶ کیا حدیثِ قرآن میں ترمیم کرتی ہے ؟
- ۳۶۷ آخری گزارش۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیسبا چہ

انکارِ سنت کا فتنہ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں اٹھا تھا۔ اور اس کے اٹھانے والے خوارج اور معتزلہ تھے۔ خوارج کو اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسلم معاشرے میں جو انار کی وہ پھیلنا چاہتے تھے اس کی راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سنت حامل تھی جس نے اس معاشرے کو ایک نظم و ضبط پر قائم کیا تھا۔ اور اس کی راہ میں حضور کے وہ ارشادات حامل تھے جن کی موجودگی میں خوارج کے انتہا پسندانہ نظریات چل سکتے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے احادیث کی صحت میں شک اور سنت کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کی دو گونہ پالیسی اختیار کی۔ معتزلہ کو اس کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ عجبی اور یانی فلسفوں سے پہلا سابقہ پیش آتے ہی اسلامی عقائد اور اصول و احکام کے بارے میں جو شکوک و شبہات ذہنوں میں پیدا ہونے لگے تھے انہیں پوری طرح سمجھنے سے پہلے وہ کسی نہ کسی طرح انہیں حل کر دینا چاہتے تھے۔ خود ان فلسفوں میں ان کو وہ بصیرت حاصل نہ ہوئی تھی کہ ان کا عقیدہ جائز لیکن ان کی صحت و قوت چیل سکتے۔ انہوں نے ہر اس بات کو جو فلسفے کے نام سے آئی سر اسر عقل کا تقاضا سمجھا اور یہ چاہا کہ اسلام کے عقائد اور اصولوں کی ایسی تعبیر کی جائے جس سے وہ ان نام نہاد عقلی تقاضوں کے مطابق ہو جائیں۔ اس راہ میں پھر وہی حدیث و سنت مانع ہوئی اس لیے انہوں نے بھی خوارج کی طرح حدیث کو مشکوک ٹھیرایا اور سنت کو حجت ماننے سے انکار کیا ان دونوں فتنوں کی غرض اور ان کی تکنیک مشترک تھی۔ ان کی غرض یہ تھی کہ قرآن کو اس کے لانے والے کی قوی و عملی تشریح و توضیح سے، اور اس نظام فکر و عمل سے جو خدا کے پیغمبر نے اپنی رہنمائی میں قائم کر دیا تھا ان کے نزدیک کتاب کی حیثیت سے لے لیا جائے

اور پھر اس کی من مانی تاویلات کر کے ایک دوسرا نظام بنا ڈالا جائے جس پر اسلام کا میل چسپاں ہو۔ اس غرض کے لیے جو تکنیک انہوں نے اختیار کیا اس کے دو حربے تھے۔
— ایک یہ کہ احادیث کے بارے میں یشک دلوں میں ڈالا جائے کہ وہ فی الواقع حضور کی ہیں بھی یا نہیں۔ دوسرے، یہ اصولی سوال اٹھا دیا جائے کہ کوئی قول یا فعل حضور کا ہو بھی تو ہم اس کی اطاعت و اتباع کے پابند کب ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم تک قرآن پہنچانے کے لیے مامور کیے گئے تھے، سوا انہوں نے وہ پہنچا دیا۔ اس کے بعد محمد بن عبد اللہ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے ہم ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا اور کیا وہ ہمارے لیے حجت کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ دونوں فتنے تھوڑی مدت چل کر اپنی موت آپ مر گئے اور تیسری صدی کے بعد پھر صدیوں تک اسلامی دنیا میں ان کا کہیں نام و نشان باقی نہ رہا۔ جن بڑے بڑے اسیاب نے اُس وقت ان فتنوں کا قلع قمع کر ڈالا وہ سب ذیل تھے:

۱۔ محدثین کا زبردست تحقیقی کام جس نے مسلمانوں کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جن روایات سے ثابت ہوتی ہے وہ ہرگز مشتبہ نہیں ہیں بلکہ نہایت معتبر ذرائع سے امت کو پہنچی ہیں، اور ان کو مشتبہ روایات سے الگ کرنے کے لیے بہترین علمی ذرائع موجود ہیں۔

۲۔ قرآن کی تصریحات، جن سے اُس زمانے کے اہل علم نے عام مسلمانوں کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ دین کے نظام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حیثیت ہرگز نہیں ہے جو منکرین سنت حضور کو دینا چاہتے ہیں۔ آپ قرآن پہنچانے کے لیے محض ایک نام پر مقرر نہیں کیے گئے تھے، بلکہ آپ کو خدا نے معلم، رہنما، مغتبر قرآن، شارع قانون اور قاضی حاکم بھی مقرر کیا تھا۔ لہذا خود قرآن ہی کی رُو سے آپ کی اطاعت و پیروی ہم پر فرض ہے اور اس سے آزاد ہو کر جو شخص قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ دراصل قرآن کا پیرو

بھی نہیں ہے۔

۳۔ منکرین سنت کی اپنی تاویلات، جن کا کھلونا قرآن کو بنا کر انہوں نے عام مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت بالکل برہنہ کر دی کہ سنتِ رسول اللہ سے جب کتاب اللہ کا تعلق توڑ دیا جائے تو دین کا حلیہ کس بڑی طرح بگڑتا ہے، خدا کی کتاب کے ساتھ کیسے کیسے کھیلے جاتے ہیں، اور اس کی معنوی تخریب کے کیسے مضحکہ انگیز نمونے سامنے آتے ہیں۔

۴۔ امت کا اجتماعی ضمیر جو کسی طرح یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان کبھی رسول کی اطاعت و پیروی سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ چند سرچھپے انسان تو ہرزائے اور ہرزوم میں ایسے نکل سکتے ہیں جو بے نیکی باتوں ہی میں تک محسوس کرتے ہوں۔ مگر پوری امت کا سرچھپا ہوا جانا بہت مشکل ہے۔ عام مسلمانوں کے ذہنی سانچے میں یہ غیر معقول بات کبھی ٹھیک نہ بیٹھ سکی کہ آدمی رسول کی رسالت پر ایمان بھی لائے اور پھر اس کی اطاعت کا فائدہ اپنی گردن سے اتار بھی پھینکے۔ ایک سیدھا سادھا مسلمان جس کے دماغ میں ٹیڑھ نہ ہو، عملاً نافرمانی کا ترکب تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ عقیدہ کبھی اختیار نہیں کر سکتا کہ جس رسول پر وہ ایمان لایا ہے اس کی اطاعت کا وہ سرے سے پابند ہی نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی بنیادی چیز تھی جس نے آخر کار منکرین سنت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی — اس پر مزید یہ کہ مسلمان قوم کا مزاج اتنی بڑی بدعت کو ہضم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہو سکا کہ اُس پورے نظام زندگی کو، اس کے تمام قاعدوں اور ضابطوں اور اداروں سمیت، رو کر دیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے شروع ہو کر خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت کی رہنمائی میں مسلسل ایک ہموار طریقے سے ارتقاء کرتا چلا آ رہا تھا اور اسے چھوڑ کر آئے دن ایک نیا نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں بنوایا جائے جو دنیا کے ہر فلسفے اور ہر تخیل سے متاثر ہو کر اسلام کا ایک جدید ایڈیشن نکالنا چاہتے ہوں۔

اس طرح فنا کے گھاٹ کو یہی گامِ تاریخ کا تہ تیہ بن گیا۔ اس کا نتیجہ ۱۵ صدیوں تک اپنی شمشان بھومی

میں پڑا رہا، یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں وہ پھر جی اٹھا۔ اس نے پہلا جنم عراق میں لیا تھا۔ اب یہ دوسرا جنم اس نے ہندوستان میں لیا۔ یہاں اس کی ابتدا کھنے والے سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی تھے۔ پھر مولوی عبداللہ چکڑالوی اس کے علمبردار بنے۔ اس کے بعد مولوی احمد الدین امرتسری نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ پھر مولانا اسلم جیراج پوری اسے لے کر آگے بڑھے۔ اور آخر کار اس کی ریاست چودھری غلام احمد پر وزیر کے حصے میں آئی جنہوں نے اس کو ضلالت کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

اس کی دوسری پیدائش کا سبب بھی وہی تھا جو دوسری صدی میں پہلی مرتبہ اس کی پیدائش کا سبب بنا تھا، یعنی بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی تہذیبوں سے سابقہ پیش آنے پر ذہنی نشست خوردگی میں مبتلا ہو جانا، اور تنقید کے بغیر باہر کی ان ساری چیزوں کو سراسر تقاضائے عقل مان کر اسلام کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا۔ لیکن دوسری صدی کی بہ نسبت تیرھویں صدی کے حالات بہت مختلف تھے۔ اُس وقت مسلمان فاتح تھے، ان کو فوجی و سیاسی غلبہ حاصل تھا، اور جن فلسفوں سے انہیں سابقہ پیش آیا تھا وہ مفتوح و مغلوب قوموں کے فلسفے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن پر ان فلسفوں کا حملہ بہت بکا ثابت ہوا اور بہت جلد ہی رد کر دیا گیا۔ اس کے برعکس تیرھویں صدی میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جبکہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکے تھے، ان کے اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی، ان کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا، ان کو معاشی حیثیت سے بُری طرح کچل ڈالا گیا تھا، ان کا نظام تعلیم ورجم برجم کر دیا گیا تھا، اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے قوانین، اور اپنے اجتماعی و سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح مسلط کر دیا تھا۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کو خاتموں کے فلسفے اور سائنس سے اور ان کے قوانین اور تہذیبی اصولوں سے سابقہ پیش آیا تو قدیم زمانے کے معتزلہ کی بہ نسبت ہزار درجہ زیادہ سخت مرعوب ذہن رکھنے والے معتزلہ ان کے اندر پیدا ہونے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب کے جو نظریات، جو

افکار و تخیلات، جو اصولِ تہذیب و تمدن اور جو قوانینِ حیات آ رہے ہیں وہ سراسر معقول ہیں ان پر اسلام کے نقطہ نظر سے تنقید کر کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے۔ زمانے کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہ ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ اس غرض سے جب انہوں نے اسلام کی مرمت کرنی چاہی تو انہیں بھی وہی مشکل پیش آئی جو قدیم زمانے کے معتزلہ کو پیش آئی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے نظامِ حیات کو جس چیز نے تفصیلی اور عملی صورت میں قائم کیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اسی سنت نے قرآن کی ہدایات کا مقصد و منشا متعین کر کے مسلمانوں کے تہذیبی تصورات کی تشکیل کی ہے، اور اسی نے ہر شعبہ زندگی میں اسلام کے عملی ادارے مضبوط بنیاد پر تعمیر کر دیے ہیں۔ لہذا اسلام کی کوئی مرمت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اس سنت سے بچھا چھڑایا جائے۔ اس کے بعد صرف قرآن کے الفاظ رہ جاتے ہیں جن کے پیچھے نہ کوئی عملی نمونہ ہوگا، نہ کوئی مستند تعبیر و تشریح ہوگی اور نہ کسی قسم کی روایات اور نظریں ہونگی۔ ان کو تاویلات کا تختہ مشق بنانا آسان ہوگا اور اس طرح اسلام بالکل ایک موم کا گولہ بن کر رہ جائے گا جسے دنیا کے ہر چلتے ہوئے فلسفے کے مطابق ہر روز ایک نئی صورت دی جاسکے گی۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے پھر وہی تکنیک، انہی دو حربوں کے ساتھ اختیار کیا جو قدیم زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، یعنی ایک طرف ان روایات کی صحت میں شک ڈالا جائے جن سے سنت ثابت ہوتی ہے، اور دوسری طرف سنت کے بجائے خود حجت و سند مچنے سے انکار کر دیا جائے۔ بین بیاں پھر حالات کے فرق نے اس تکنیک اور اس کے حربوں کی تفصیلی صورت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔ قدیم زمانے میں جو لوگ اس فتنے کا علم لے کر اٹھے تھے وہ ذہنی علم لوگ تھے۔ عربی زبان و ادب میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم میں کافی دہک رکھتے تھے۔ اور ان کو سابقہ بھی اُس مسلمان پبلک سے تھا جس کی علمی زبان عربی تھی، جس میں عام لوگوں کو تعلیم و محاسبہ نہ تھا، جس میں علومِ دینی کے ماہرین

بہت بڑی تعداد میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور ایسی پبلک کے سامنے کوئی کچی کچی بات لاکر ڈال دینے سے خود اس شخص کی ہوا خیزی ہو جانے کا خطرہ تھا جو ایسی بات لیکر آئے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے معتزلہ بہت سنجیدہ بات کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے دور میں جو لوگ اس فتنے کو ہوا دینے کے لیے آئے ہیں ان کا اپنا علمی پایہ بھی سرسید کے ماتھے سے لے کر آج تک درجہ بدرجہ ایک دوسرے سے فروتر ہوتا چلا گیا ہے، اور ان کو سابقہ بھی ایسی پبلک سے پیش آیا ہے جس میں عربی زبان اور دینی علوم جاننے والے کا نام ”تعلیم یافتہ“ نہیں ہے اور ”تعلیم یافتہ“ اس شخص کا نام ہے جو دنیا میں اور چاہے سب کچھ جانتا ہو مگر قرآن پر بہت ہرمانی کرے تو کبھی کبھار اس کو ترجموں — اور وہ بھی انگریزی ترجموں — کی مدد سے پڑھ لے، حدیث اور فقہ کے متعلق حد سے حد کچھ سنی سنائی معلومات — اور وہ بھی مستشرقین کی پہنچائی ہوئی معلومات — پر اکتفا کرے، اسلامی روایات پر زیادہ سے زیادہ ایک اچٹنی ہوئی نگاہ ڈال لے اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ یہ کچھ بوسیدہ بڈیوں کا مجموعہ ہے جسے ٹھکرا کر زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے، پھر اس ذخیرہ علم دین کے بل بوتے پر وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ اسلام کے بارے میں آخری اور فیصلہ کن رائیں قائم کرنے کی وہ پوری اہمیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے حالات میں پُرانے اعتزال کی بہ نسبت نئے اعتزال کا معیار جیسا کچھ گھٹیا ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ یہاں علم کم اور بے علمی کی جسارت بہت زیادہ ہے! اب جو مکتبک اس فتنے کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

۱، حدیث کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے مغربی مستشرقین نے جتنے حربے استعمال کیے ہیں ان پر ایمان لانا اور اپنی طرف سے حواشی کا اضافہ کر کے انہیں عام مسلموں میں پھیلا دینا تاکہ ناواقف لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے سوا کوئی چیز بھی امت مسلمہ کی نہیں بنی ہے۔

(۲) احادیث کے مجموعوں کو عیب چینی کی غرض سے کھنگانا — ٹھیک اسی طرح جیسے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں نے کبھی قرآن کو کھسکا لیا تھا — اور ایسی چیزیں نکال نکال کر بلکہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا جن سے یہ تاثر دیا جاسکے کہ حدیث کی کتابیں نہایت سرنسکا یا مضحکہ خیز مواد سے لبریز ہیں، پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ اپیل کرنا کہ اسلام کو رسوائی سے بچانا ہے تو اس سائے دفتر بے معنی کو غرق کر دو۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو محض ایک ڈاکیے کا منصب قرار دینا جس کا کام بس اس قدر تھا کہ لوگوں کو قرآن پہنچا دے۔

(۴) صرف قرآن کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دینا اور سنت رسول کو اسلام کے قانونی نظام سے خارج کر دینا۔

(۵) امت کے تمام فقہاء، محدثین، مفسرین اور ائمہ لغت کو ساقط الاعتبار قرار دینا تاکہ مسلمان قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے ان کی طرف رجوع نہ کریں، بلکہ ان کے متعلق اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ ان سب سے قرآن کی حقیقی تعلیمات پر پردے ڈالنے کے لیے ایک سازش کر رکھی تھی۔

(۶) خود ایک نئی لغت تصنیف کر کے قرآن کی تمام اصطلاحات کے معنی بدل ڈالنا اور آیات قرآنی کو وہ معنی پہنچانا جن کی کوئی گنجائش دنیا کے کسی عربی داں آدمی کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے۔ (لطیف یہ ہے کہ جو صاحب یہ کام کر رہے ہیں ان کے سامنے قرآن کی چند آیتیں اعواب کے بغیر کھد کر رکھ دی جائیں تو وہ انہیں صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اب خود عرب بھی عربی نہیں جانتے اس لیے اگر ان کے بیان کردہ حنوں کی گنجائش کسی عرب کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے تو قصور اس عرب ہی کا ہے)۔

اس تخریبی کام کے ساتھ ساتھ ایک نئے اسلام کی تعمیر بھی ہو رہی ہے جس کے بنیادی اصول تعداد میں صرف تین ہیں، مگر دیکھیں کہ یہ کچھ بے غیر اصول ہیں :

اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ تمام شخصی املاک کو ختم کر کے ایک مرکزی حکومت کے تصرف میں دے دیا جائے اور وہی حکومت افراد کے درمیان تقسیم رزق کی منتا رکھل ہو۔ اس کا نام ہے ”نظام ربوبیت“ اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصود یہی نظام قائم کرنا تھا۔ مگر پچھلے تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کو اسے سمجھنے کی توفیق میسر نہ ہوئی، صرف حضرت ماکس اور ان کے خلیفہ خاص حضرت اینجلز قرآن کے اس مقصد اصل کو پاسکے۔

اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام پارٹیاں اور جماعتیں توڑ دی جائیں اور مسلمانوں کو قطعاً کوئی جماعت بنانے کی اجازت نہ دی جائے تاکہ وہ معاشی حیثیت سے بے بس ہو جانے کے باوجود اگر مرکزی حکومت کے کسی فیصلے کی مزاحمت کرنا چاہیں تو غیر منظم ہونے کی وجہ سے نہ کر سکیں۔

اس کا تیسرا اصول یہ ہے کہ قرآن میں جس اللہ اور رسول پر ایمان لانے، اور جس کی اطاعت بجالانے، اور جسے آخری سند تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد ہے ”مرکزیت“ یہ مرکزیت چونکہ خود اللہ اور رسول ہے اس لیے قرآن کو جو معنی وہ پہنائے وہی اس کے اصل معنی ہیں۔ اس کے کسی حکم یا قانون کے متعلق یہ سوال سرے سے اٹھایا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ جو کچھ وہ حرام کرے وہ حرام اور جو کچھ وہ حلال کرے وہ حلال۔ اس کا فرمان شریعت ہے اور عبادات سے لیکر معاملات تک جس چیز کی جو تنگی بھی وہ تجویز کرے اس کا ماننا فرض بلکہ شرط اسلام ہے۔ جس طرح ”بادشاہ غدلی نہیں کر سکتا اسی طرح“ مرکزیت بھی سبوح و قدوس ہے۔ لوگوں کا کام اس کے سامنے بس ہر جھکا دینا ہے۔ ”اللہ اور رسول“ نہ تنقید کے ہدف بن سکتے ہیں، نہ ان کے خطا کار ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے، اور نہ ان کو بدلا ہی جاسکتا ہے۔

اس نئے اسلام کے ”نظام ربوبیت“ پر ایمان لانے والے تو ابھی بہت کم ہیں۔ لیکن اس کے باقی تمام تعمیری اور تخریبی خواہشیں مخصوص حلقوں میں بڑے مقبول ہو رہے ہیں۔

ہمارے حکمرانوں کے لیے اس کا تصور مرکزیت بہت اپیل کرنے والا ہے، اس لازمی شرط کے ساتھ کہ مرکزیت وہ خود ہوں۔ اور یہ خیال بھی انہیں بہت پسند آتا ہے کہ تمام ذرائع ان کے تصرف میں ہوں اور قوم پوری طرح غیر منظم ہو کر ان کی منہی میں آجائے۔ ہمارے جموں اور قانون پیشہ لوگوں کا ایک عنصر اسے اس لیے پسند کرتا ہے کہ انگریزی حکومت کے دور میں جس قانونی نظام کی تعلیم و تربیت انہوں نے پائی ہے اس کے اصولوں اور بنیادی تصورات و نظریات اور جزئی و فروعی احکام سے اسلام کا معروف قانونی نظام قدم قدم پر ٹکراتا ہے اور اس کے ماخذ تک بھی ان کی دسترس نہیں ہے، اس بنا پر وہ اس خیال کو بہت پسند کرتے ہیں کہ سنت اور فقہ کے جھنجھٹ سے انہیں نجات مل جائے اور صرف قرآن باقی رہ جائے جس کی تاویل کرنا جدید بحث کی مدد سے اب اور بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مغربیت زدہ لوگوں کو یہ مسئلہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے کیونکہ اسلام سے نکل کر مسلمان رہنے کا اس سے زیادہ اچھا نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ آخر اس سے زیادہ مرے کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ مغرب میں حلال اور حلالہ کے اسلام میں آج تک حرام رہا ہے وہ حلال بھی ہو جائے اور قرآن کی سند ان حلال کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔

میں پچھلے پچیس چھبیس سال میں اس فتنے کی تردید کے لیے بہت سے مضامین لکھ چکا ہوں جو میری متعدد کتابوں میں درج ہیں۔ اس وقت جن مضامین کا مجموعہ ترجمان القرآن کے ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے، اور انشاء اللہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو گا وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں وہ پوری مراسلت یکجا کر دی گئی ہے جو سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں میرے اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ اس مراسلت کے عرف ابتدائی اجزاء اس سے پہلے ترجمان القرآن کے متفرق پرچوں میں شائع ہوئے تھے، مگر اب مناسب یہ سمجھا گیا کہ اسے یکجا شائع کیا جائے تاکہ دونوں طرف کی پوری بات بیک وقت ناظرین کے سامنے آجائے۔ دوسرے حصہ میں مغربی ماسکٹین ہائی کورٹ کے ایک مرن

جس محمد شفیع صاحب کا ایک فیصلہ نقل کیا جا رہا ہے جو انہوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۶۱ء کو مقدمہ رشید بیگم بنام شہابیہ میں دائر فرمایا ہے۔ اور میں اس پر مفصل تنقید کی ہے ان دونوں حصوں میں ناظرین ایک طرف منکرین سنت کے تمام مسائل اور لائل ان کی اپنی زبان میں ملاحظہ فرمائیے اور دوسری طرف انہیں یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ دین کے نظام میں سنت کی اصل حیثیت کیا ہے۔ اس کے بعد یہ رائے قائم کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ کس مسلک کو قبول کرتا ہے۔

جن حضرات تک یہ مجموعہ مضامین پہنچے ان سے میں ایک خاص گزارش کرنا چاہتا ہوں یہ بحث دین کے ایک نہایت اہم بنیادی مسئلے سے تعلق رکھتی ہے جس میں کسی ایک پہلو کو ترک اور دوسرے کو اختیار کرنے کے نتائج بڑے دور رس ہیں۔ بد قسمتی سے دین کی اساس کے متعلق یہ بحث ہمارے ملک میں نہ صرف چھڑ چکی ہے بلکہ ایک نازک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار کا ایک معتد بہ عنصر انکار سنت کے مسلک سے متاثر ہو رہا ہے۔ ہماری اعلیٰ عدالتوں کے جج اس کا اثر قبول کر رہے ہیں حتیٰ کہ ہائی کورٹ سے ایک فیصلہ کلینٹ انکار سنت کی بنیاد پر صادر ہو چکا ہے جو آگے نہ معلوم اور کن کن مقدمات میں نظیر کا کام دے۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں، اور خصوصاً سرکاری دفتروں میں یہ تحریک منظم طریقے سے چل رہی ہے۔ اس لیے یہ غروری ہے کہ جن حضرات تک بھی یہ مجموعہ پہنچے وہ نہ صرف خود گہری نگاہ سے اس کا مطالعہ فرمائیں، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائیں قطع نظر اس سے کہ وہ سنت کے قائل ہوں یا منکر۔ رائے جو شخص جیسی بھی چاہے قائم کرے، مگر کسی پڑھے لکھے آدمی کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ محض ایک رُخنے مطالعہ پر اپنا ایک ذہن بنالے اور دوسرا رُخ دیکھنے سے انکار کر دے۔ اس مجموعہ میں چونکہ دونوں رُخ پوری دصاحت کے ساتھ آگئے ہیں اس لیے امید ہے کہ یہ قائلین سنت اور منکرین سنت، دونوں کو ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد دے گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

سُنّت کی آئینی حیثیت

ایک اہم مراسلت

[ذیل میں وہ مراسلت درج کی جا رہی ہے جو ”بزمِ طلوعِ اسلام“ کے ایک نمایاں فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مُصنّف کے درمیان سُنّت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوئی تھی]

ڈاکٹر صاحب کا پہلا خط

مخدوم و محترم مولانا! دامِ ظلکم
اسلام علیکم۔ دستوری تدوین کے اس فیصلہ کُن مرحلے پر ہر سچے مسلمان کی دینی اہمگوں کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کا آئین اسلام کی مستقل اقدار کی اساس پر ترتیب و تکمیل پائے۔ اس سلسلے میں آئینی کمیشن کے سوانامہ کے جواب میں آپ اور دیگر حضرات کرام کا یہ متفقہ مطالبہ بھی سامنے آیا ہے کہ آئین پاکستان کی بنیاد ”کتاب و سُنّت“ پر ہونی چاہیے۔ مجھے نہ تو ”سُنّت“ کی حقیقی اہمیت سے مجالِ انکار ہے اور نہ اس کی اس اہمیت کو ختم کرنا مقصود لیکن جب اسلامی آئین کی اساس کے طور پر ”سُنّت“ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایک اشکال ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے اور اس سے جو سوال ابھرتے ہیں انہیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اولین فرصت میں اس اشکال کا حل تحریر فرمائیں گے۔

سوالات حسب ذیل ہیں:

۱، آپ کے نزدیک ”سُنّت“ سے کیا مراد ہے؟ یہی جس طرح ”کتاب“ سے مراد

قرآن مجید ہے اسی طرح سنت (یعنی سنت رسول اللہ) سے کیا مراد ہے؟

(۲) کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنت رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو؟ یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟

(۳) کیا سنت رسول اللہ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کا متن؟

(۴) اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہ ہے یا نہیں؟

میں آپ کو یقین دلا دوں کہ جہاں تک اسلامی آئین کی ضرورت کا تعلق ہے میں قلب و نظر کی پوری ہم آہنگی سے اسے ایک مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہوں۔ میری ان مخلصانہ گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی آئین کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام پسند ذہنوں میں اس کا ایک واضح متفق علیہ اور ممکن عمل تصور موجود ہونا کہ ملک لادینی ذہن جو پوری شدت سے اسلامی آئین کے خلاف مصروف کار ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام پسند عناصر میں انتشار کی صورت پیدا نہ کر سکے۔ چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پاتی جاتی ہے اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصوٰفہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ والسلام

نیاز آگئیں : عبد الوہود

جواب

مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عنایت نامہ مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۶۰ء وصول ہوا۔ آپ نے جو سوالات کیے ہیں وہ آج پہلی مرتبہ آپ نے پیش نہیں کیے ہیں۔ اس سے پہلے ہی سوالات دوسرے گوشوں سے آچکے ہیں اور ان کا

جواب بھی میں واضح طور پر دے چکا ہوں۔ ایک ہی طرح کے سوالات کا مختلف گوشوں سے بار بار دہرایا جانا اور پہلے کے دیے ہوئے جوابات کو ہمیشہ نظر انداز کر دینا کوئی صحیح بات نہیں ہے اگر بالفرض آپ کے علم میں میرے وہ جوابات نہیں ہیں جو میں اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں تو میں اب آپ کو ان کا حوالہ دیتے دیتا ہوں ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جنوری ۱۹۷۵ء صفحہ ۲ تا ۲۲۰۔ دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۶۰ تا ۱۷۰۔ آپ انہیں پڑھ کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے، اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔

اگر آپ اپنے اس عنایت نامے کے ساتھ میرے اس جواب کو شائع کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں تو براہ کرم میرے مذکورہ بالا دونوں مضامین بھی بحسنہ شائع فرمادیں۔ کیونکہ دراصل وہی میری طرف سے آپ کے ان سوالات کا جواب ہیں، اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط

مولانا تھے محترم! زید مجدکم

اسلام علیکم۔ گرامی نامہ ملا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اس کا علم ہے کہ اس قسم کے سوالات اس سے پہلے بھی کئی گوشوں سے کیے گئے ہیں لیکن مجھے خاص طور پر استفسار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میری نظر سے ان سوالات کے ایسے جوابات آج تک نہیں گزرے جو متعین اور واضح ہوں۔

آپ نے اپنے جن مضامین کی نشاندہی فرمائی ہے میں نے انہیں دیکھا ہے لیکن مجھے بڑے افسوس سے یہ عرض کرنے دیجئے کہ ان سے بھی میرے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا بلکہ ان سے میری الجھن بڑھ گئی ہے۔ اس لیے کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی دوسری تحریروں سے مختلف ہیں۔ بہر حال چونکہ میرا مقصد مناظرہ بازی نہیں اور نہ آپ کے احترام کے پیش نظر میں ایسی جرأت کر سکتا ہوں، بلکہ محض بات کا سمجھنا ہے اس لیے جو کچھ میں آپ کے مضامین سے سمجھ سکا ہوں اُسے نیچے لکھتا ہوں۔ اگر میں نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے تو توثیق فرما دیجیے اور اگر غلط سمجھا ہے تو براہ کرم اس کی تصریح کر دیجیے۔ اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

۱) آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ، نئے بیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اُسے سنت رسول اللہ کہتے ہیں۔ اس سے یہ دو نتیجے نکلتے ہیں۔

۲) رسول اللہ ﷺ نے اس بیس سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے

(ب) سنت، قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنت رسول اللہ تمام کمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو

(۳) آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائے گا اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرب آخر

نہیں۔ اصول روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائے گا اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہوگی جن میں علوم اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی نصیرت پیدا ہو چکی ہو۔

(۴) احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جاسکے گا کہ یہ اسی طرح کلام رسول میں جس طرح قرآن کی آیات، اللہ کا کلام

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

نیاز آگین

عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ مئی سنہ ۱۴۲۸ھ ڈاک سے مل چکا تھا اس کے بعد اپنے دوبارہ ۲۸ مئی کو دستی بھی اس کی ایک نقل مجھے ارسال فرمادی لیکن میں مسلسل مصروفیت کے باعث اب تک جواب نہ دے سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اپنے اس عنایت نامہ میں یہ یقین دلایا ہے کہ آپ کا مقصد اس مراسلت سے کوئی مناظرہ بازی نہیں ہے بلکہ آپ بات سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ جیسے شخص سے اسی چیز کا متوقع بھی تھا لیکن جو طریقہ آپ نے اپنی مراسلت میں بات سمجھنے کے لیے اختیار فرمایا ہے وہ اس یقین دہانی کے ساتھ کچھ مبالغہ نہ رکھنا ہو، کم از کم مجھے تو محسوس نہیں ہوتا۔ آپ ذرا اپنا ۲۸ مئی کا خط نکال کر ملاحظہ فرمائیں اس میں آپ نے ہم متعین سوالات میرے سامنے پیش کر کے ان کا جواب مانگا تھا۔ میں نے اسی تاریخ کو اس خط کے جواب میں آپ کو لکھا کہ آپ جنوری ۲۰۰۷ء اور دسمبر ۲۰۰۷ء کے ترجمان القرآن میں میرے فلاں فلاں مضامین ملاحظہ فرما کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ لیکن آپ نے ان مضامین کو ملاحظہ فرما کر اپنے ابتدائی سوالات کی روشنی میں ان پر کوئی کلام کرنے کے بجائے کچھ اور سوالات ان پر قائم کر دیئے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں۔ کیا واقعی یہی کسی بات کو سمجھنے کا طریقہ ہے کہ ایک بحث کو طے کرنے سے پہلے دوسری بحث چھیڑ دی جائے اور بلا نہایت اسی طرح بات میں سے بات نگانے کا سلسلہ چلتا رہے؟

آپ کے نئے سوالات پر اس وقت جواب نہیں دیتا ہوں کہ آپ اپنے ابتدائی

سوالات کی طرف پٹیں اور خود دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک کا میرے ان مضامین میں کیا جواب آپ کو ملا تھا اور آپ نے اس سے کس طرح گریز کیا ہے۔

سُنّت کیا چیز ہے؟ | آپ نے چار سوالات اس بنا پر اٹھاتے تھے کہ ہم نے آئین کمیشن کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اسلامی آئین کی اساس کے طور پر سنت کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کے یہ سوالات سنت کی قانونی حیثیت سے متعلق تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا پہلا سوال یہ تھا۔ ”آپ کے نزدیک سنت سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح ”کتاب“ سے مراد قرآن

ہے اسی طرح سنت (یعنی سنت رسول اللہ) سے کیا مراد ہے؟

اس کے جو جوابات میرے مذکورہ بالا مضامین میں آپ کے سامنے آئے وہ یہ ہیں:

”یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون (SUPREME LAW) ہے جو حاکم

اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن، جو لفظ بلفظ خداوند عالم کے احکام و

ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ، یا آپ کی سنت

جو قرآن کے نفاذ کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر

نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ اس کے

مقرر کیے ہوئے رہنما، حاکم اور معتمد بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور

عمل سے قانونِ الہی کی تشریح کریں۔ اس کا صحیح نفاذ سمجھائیں۔ اس کے نفاذ کے

مطابق افراد کی تربیت کریں۔ پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی

شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں، پھر اس اصلاح شدہ

معاشرے کو ایک صالح و معالج ریاست کی صورت دیکر یہ دکھادیں کہ اسلام کے

اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا یہ پورا

کام، جو ۲۳ سال کی پیغمبری میں کیا گیا، وہ سنت ہے جو قرآن

کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانون برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے۔“

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۱۰-۲۱۱)

”یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن ہی دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی، ایک نیا نظام تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ رسول پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ہیچا نے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے بہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اُسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا؟ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔“

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں تھے بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ہر، حاکم اور مُعتم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہل ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا گیا تھا۔ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جاتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق

ہے وہ آغاز اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الطاعت مانتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرت کی ہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ دوسرا ماخذ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلج کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوت قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ہی ان کی حیثیت نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرت کو بطور خود سے دیا ہے یا قرآن نے حضور کو یہ مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔“

(ترجمان القرآن - جنوری ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۱۶-۲۱۷)

اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے اس سوال کا جواب ملایا نہیں کہ ”سنت“ مراد کیا ہے؟ اور آپ کو یہ معلوم ہوا یا نہیں کہ اسلامی آئین کی اساس کے طور پر جس سنت کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہیے تھی کہ آیا آپ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں اور کوئی کام کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو وہ کس حیثیت میں تھا؟ اگر آپ کی رائے میں یہ کام کر دینے کے بعد آنحضرت صرف ایک مسلمان تھے عام مسلمانوں کی طرح، اور ان نرا انداز تلاوت قرآن اقوال و افعال میں آنحضرت کی حیثیت ایک نبی کی نہ تھی، تو صاف صاف یہ بات کیسے اور یہ بھی بتائیے کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ یہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا قرآن کے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ اور اگر آپ کو خدا کے مقرر کردہ ہادی حاکم، قاضی

معلم، مربی کی حیثیت سے آنحضرتؐ نے ایک مسلم معاشرہ تیار کرنے اور ایک ریاست کا نظام بنا کر اور چلا کر دکھانے کا جو کارنامہ انجام دیا اس میں آپؐ کی حیثیت ایک نبی کی تھی تو یہ وہی سنت ہے یا نہیں جسے اسلام میں آئین کی اساس کا مرتبہ حاصل ہونا چاہیے؟ یہ بحث بعد کی ہے کہ اس سنت کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے اور کن پر نہیں ہوتا۔ پہلے تو آپؐ یہ بات صاف کریں کہ قرآن کے علاوہ سنت رسول اللہؐ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور اس کو آپؐ قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتے ہیں یا نہیں؟ اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ بنیادی بات جب تک صاف نہ ہو لے ان ضمنی سوالات پر جو آپؐ نے اپنے دوسرے عنایت نامے میں چھیڑے ہیں بحث کرنے کا آخر فائدہ کیا ہے؟

سنت کس شکل میں موجود ہے؟ | آپؐ کا دوسرا سوال یہ تھا:

”کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنت رسول اللہؐ

مرتب شکل میں موجود ہو، یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟“

اس سوال کا جو جواب میرے محوٰۃ بالا مضامین میں موجود تھا، اور اگر آپؐ ان کو بغور پڑھا ہے تو آپؐ کے سامنے بھی وہ آیا ہوگا، اسے میں پھر یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جب نہیں تو اب آپؐ اسے ملاحظہ فرمائیں:

”سنت کو بجائے خود ماخذ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے

معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کر دینگا کہ آج پونے چودہ سو

سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس سوال سے سابقہ پیش نہیں آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار

سال قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں

نامقابلہ نکار ہیں:

ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے

آغاز میں پہلے دن قائم ہوا، اس وقت تک مسلسل زندہ ہے، اس کی زندگی

میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے، اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرز فکر، اخلاق اور اقدار (VALUES)، عبادات اور معاملات، نظریہ حیات اور طریق حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روستے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے، یہی امر اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو کسی ایک ہی سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں اندھیرے میں ٹٹولنا پڑے ہو۔

دوسری تاریخی حقیقت، جو اتنی ہی روشن ہے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنتِ ثابۃ کیا ہے اور کیا نئی چیز ان کے نظامِ حیات میں کسی جعلی طریقے سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ سنت ان کے لیے قانون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہونے لگے اور ان کے گھروں سے بیکر حکومتوں تک کے معاملات چلنے لگے، اس لیے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لاابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانہ سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسل میراث میں ملے ہیں، اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معضلہ ہے جس سے وہ آج یکایک دوچار ہو گیا ہے۔

اسی مسئلے پر دوبارہ روشنی ڈالتے ہوئے میں نے اپنے دوسرے مضمون میں جس کا
الہ بھی میں پہلے آپ کو دے چکا ہوں، یہ لکھا تھا کہ :

”وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پُریشور
اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارح، مرقی،
معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے بیکر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک
مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے، سکھائے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں
پر ہوتی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور ناسک حج کی جو تعلیم
دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رواج پاگئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان
من کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی
نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوتی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں، اسی
طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر کیے انہی پر مسلم
خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، عین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں
میں چلن ہونے لگا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے
لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی
کے ساتھ کیے وہی مسلم ملک کے ضابطے بن گئے، اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور
اس کا نظام حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ نے
نحو رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ نے
سنت اسلام کا جز بنا لیا۔“

یہ وہ معلوم و مشہور سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لیکر خاندان، منڈی، عدالت
ایوان حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام
ادارات نے حضور کی زندگی پر عمل کیا اور بعد میں خلفائے

راشدین کے عہد سے لیکر دورِ حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کا ڈھانچہ انہی پر قائم ہے پچھلی صدی تک تو ان ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لا کے ادارات مثلاً درہم برہم ہو جانے سے ہوا ہے۔۔۔۔۔ ان سنتوں کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل، دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۹

چرا اسی سلسلے میں آگے چل کر مزید تشریح کرتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا تھا:

”ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ بھی جنہیں حضورؐ کی زندگی میں شہرت اور رواج عام حاصل نہ ہوا تھا، جو مختلف اوقات میں حضورؐ کے کسی فیصلے، ارشاد، امر و نہی، تقریر و اجازت، یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خالص اس شخص کے علم میں آتی تھیں اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔۔۔۔۔ ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا، امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضورؐ کی وفات کے بعد فوراً ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفاء، حکام، قاضی، مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آنے والے مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عملی اپنی رائے اور انتباہ کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اس شخص کی تلاش شروع ہوتی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا، اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا خود بھی

لے شرعی اصطلاح میں تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے سامنے کوئی کام ہوتے دیکھا ہو، یا کوئی طریقہ رائج پایا ہو اور اسے منع نہ کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقریر کے معنی ہیں کسی چیز کو برقرار رکھنا۔

اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایت حدیث کا نقطہ آغاز ہے اور
 سلسلہ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری
 رہا ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی کوششیں بھی
 کیں وہ قریب قریب سب ناکام بنا دی گئیں۔ کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت
 یا ساقط ہوتا تھا، جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی، جن سے کوئی شخص سزا
 پاسکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا، غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین
 کا مدار تھا، ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مندریں اتنی بے پڑا
 نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال ابنی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور
 ایک حاکم یا جج یا مفتی اسے مان کر کوئی حکم صادر کر ڈالتا۔ اسی لیے جو سنتیں احکام
 سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی، سخت تنقید کی چھنیوں سے
 ان کو چھانا گیا، روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور روایت کے اصولوں
 پر بھی، اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی ہے یا
 رد کر دی گئی ہے، تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیق رائے
 قائم کر سکے۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

اس جواب کو بغور ملاحظہ فرمائیے کہ بعد اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے دوسرے
 سوال کا جواب ملا یا نہیں۔ ممکن ہے آپ اس پر یہ کہیں کہ تم نے قرآن کی طرح ایک جامع و
 مانع کتاب کا نام تو دیا نہیں جس میں "سنت رسول اللہ مرتب شکل میں" موجود ہو۔ مگر میں عرض
 کروں گا کہ میرے اس جواب پر یہ اعتراض ایک کج بحثی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ آپ ایک
 پڑھے لکھے ذہنی ہوش آدمی ہیں کیا آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ایک معاشرے اور
 ریاست کا پورا نظام صرف ایک مدون کتاب آئین (CODE) ہی پر نہیں چلا کرتا ہے بلکہ

نظائر (PRECEDENTS)۔ عدالتی فیصلوں، انتظامی احکام، اخلاقی ہدایات وغیرہ کا ایک وسیع سلسلہ بھی ہوتا ہے جو کتاب آئین پر عملاً ایک نظام زندگی چلنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ چیز ایک قوم کے نظام حیات کی جان ہوتی ہے جس سے الگ کر کے محض اس کی کتاب آئین نہ تو اس کے نظام حیات کی پوری تصویر ہی پیش کرتی ہے، نہ وہ ٹھیک طور پر سمجھی ہی جا سکتی ہے۔ اور یہ چیز دنیا میں کہیں بھی کسی "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں ہوتی، نہ ہو سکتی ہے، نہ ایسی کسی "ایک کتاب" کا فقدان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس قوم کے پاس اس کی کتاب آئین کے سوا کوئی ضابطہ و قانون موجود نہیں ہے۔ آپ انگلستان، امریکہ، یا دنیا کی کسی اور قوم کے سامنے یہ بات ذرا کہہ کر دیکھیں کہ تمہارے پاس تمہارے مدون قانون (CODIFIED LAW) کے سوا جو کچھ بھی ہے سب ساقط الاعتبار ہے۔ اور تمہاری تمام روایات وغیرہ کو یا تو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہونا چاہیے ورنہ انہیں آئینی حیثیت سے بالکل ناقابل لحاظ قرار دیا جانا چاہیے، پھر آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا ارشاد کتنے وزن کا مستحق قرار پاتا ہے۔

کسی کا یہ کہنا کہ عہد نبوی کے روایات، روایات، نظائر، فیصلوں، احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب شدہ ملنا چاہیے تھا، و حقیقت ایک خاص غیر عملی طرز فکر ہے اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے آج اس زمانے کی حالت کو لے لیجیے جب کہ احوال و وقائع کو ریکارڈ کرنے کے لیے ذرائع بے حد ترقی کر چکے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو ۱۳ سال تک شب و روز کی مصروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک برپا کرتا ہے۔ ہزاروں افراد کو اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لیکر ایک پورے ملک کی فکری، اخلاقی تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت و رہنمائی میں rasailojaraid.com کی نئی ریاست وجود میں لاتی ہے۔

اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونہ ہدایت بنی رہتی ہے۔ ہر حالت میں لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملنے رہتے ہیں اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معاملات، غرض ہر شعبہ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی احکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شاعر، مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں بھی یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اس کا ریکارڈ ایک کتاب کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ ریکارڈ ہو سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہدایت اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جاسکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریریں سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار شناس کی ریوٹیں سب کی سب ناقابل اعتماد ہیں کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ ”ایک کتاب کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے، اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ وہ ”ایک جامع و مانع کتاب“ کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟ ان امور پر اگر بحث کی نیت سے نہیں بلکہ بات سمجھنے کی نیت سے غور کیا جائے تو ایک ذی فہم آدمی خود محسوس کرے گا کہ یہ ”ایک کتاب“ کا مطالبہ کتنا مہمل ہے۔ اس طرح

کی باتیں ایک کمرے میں بیٹھ کر چند نیم خواندہ اور فریب خوردہ عقیدت مندوں کے سامنے کر لی جاتیں تو مضایقہ نہیں، مگر کھلے میدان میں پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے ان کو چیلنج کے انداز میں پیش کرنا بڑی جسارت ہے۔

کیا سنت متفق علیہ ہے؟ آپ کا تیسرا سوال یہ تھا :

اور اس کی تحقیق کا ذریعہ کیا ہے؟ دو کیا سنت رسول اللہ کی اس کتاب کا متن

تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح کہ قرآن کا متن؟

اور چوتھا سوال یہ کہ :

”اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ باسانی معلوم کیا جاسکتا

ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہ ہے یا نہیں؟

ان سوالات کے جواب میں اپنے جن مضامین کی طرف میں نے آپ کو توجہ دلائی

تھی ان کو اگر آپ نے پڑھا ہے تو ان کے اندر یہ عبارتیں آپ کی نظر سے گزری ہونگی :

”بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں

اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام و

ارشادات کے معنی متعین کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات

اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لیے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لیے

انہیں کیسے دلیل بنایا جاسکتا ہے۔ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے

ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص کسی چیز کے حکم قرآن یا حکم سنت ہونے

کا دعویٰ کرے وہ اپنے تئوں کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر دُرُنی ہو گا تو امت

کے اہل علم سے، یا کم از کم اس کے کئی کئی علماء سے اپنا سکہ منوائے گا۔ اور جو

بابت دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہوگی وہ بہر حال نہ چل سکے گی یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکام قرآنی کی کسی تفسیر و تعبیر اور سننِ ثابتہ کے کسی مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کیا ہے۔ ” (ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۱۹)

”اگر مختلف فیہ سنت کا بجائے خود مرجع و سند (AUTHORITY) ہونا

نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الواقع سنتِ ثابتہ ہے یا نہیں، تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کا مفہوم و منشا متعین کرنے میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحبِ علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ حقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار (جس ایس۔ اے۔ رحمن) نے خود قرآن مجید میں اختلافِ تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہ سنت ”کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے؟

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون دان سے جیسے کہ محترم مکتوب نگار ہیں، مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے، یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصلی منشا قرار دیا ہو، اُس کے علم اور دائرہ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقت میں یہی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ، یا مجاہد، یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے، اس کے حکم رسول ہے، اگرچہ قطعی طور

پر نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقت میں بھی رسول کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ کے نزدیک کیا، لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور رسول کو آخری سند (FINAL AUTHORITY) مان رہے ہیں، ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم بجائے خود ہمارے لیے قانون واجب الاتباع ہے۔“

(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۶۲)

دُستوں کا معتد بہ حصہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے، اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے کسی چیز کو سنت مانا ہے اور بعض نے اسے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں اہل علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال، اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی راستہ قائم کر سکے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ سنت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ اُن لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبہ علم سے واقف نہیں ہیں اور جنہیں بس دُور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے۔ (ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۶۹)

میں نے آپ کے مذکورہ بالا دونوں سوالات کے جواب میں ان عبارات کے مطالعہ مشورہ اس امید پر دیا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ ذی ہوش آدمی، جو بات سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو، انہیں پڑھ کر اپنی اُس بنیادی غلطی کو خود سمجھ لے گا جو اس کے سوالات میں موجود ہے، اور اس کی سمجھ میں آپ سے آپ یہ بات آجاسے گی کہ سنت کی تحقیق میں اختلاف، اُس کو آئین کی بنیاد بنانے میں اسی طرح مانع نہیں ہو سکتا جس طرح قرآن کی تعلیم میں اختلاف اُسے آئین کی بنیاد

قرار دینے میں مانع نہیں ہے۔ لیکن آپ نے نہ اس غلطی کو محسوس کیا نہ بات سمجھنے کی کوشش فرمائی اور اُٹے مزید کچھ سوالات چھیڑ دیئے۔ میں آپ کے چھیڑے ہوئے ان سوالات سے تو بعد میں تعرض کروں گا۔ پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ اگر آپ کے نزدیک وہی چیز آئین کی بنیاد بن سکتی ہے جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو اس آسمان کے نیچے دنیا میں وہ کیا چیز ایسی ہے جو انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سے بحث کرتی ہو اور اس میں انسانی ذہن اختلاف کی کوئی گنجائش نہ پاسکیں؟ آپ قرآن کے متعلق اس سے زیادہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کا متن متفق علیہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فلاں فقرہ قرآن کی آیت ہے لیکن کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ آیات قرآنی کا منشا سمجھنے، اور ان سے احکام اخذ کرنے میں شبہات اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں؟ اگر ایک آئین کی اصل غرض الفاظ بیان کرنا نہیں، بلکہ احکام بیان کرنا ہے تو اس غرض کے لحاظ سے الفاظ میں اتفاق کا کیا فائدہ ہوا جبکہ احکام اخذ کرنے میں اختلاف ہے، رہا ہے اور ہمیشہ ہو سکتا ہے؟ اس لیے یا تو آپ کو اپنے اس نقطہ نظر میں تبدیلی کرنی ہوگی کہ ”آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہو سکے، یا پھر قرآن کو بھی اس آئین ماننے سے انکار کرنا ہوگا و حقیقت اس شرط کے ساتھ تو دنیا میں سرے سے کوئی آئین ہو ہی نہیں سکتا۔ جن سطنتوں کا کوئی مکتوب آئین (WRITTEN CONSTITUTION) سرے سے ہے ہی نہیں (مثلاً برطانیہ) ان کے نظام کا تو خیر خدا ہی حافظ ہے، مگر جن کے ہاں اب مکتوب آئین موجود ہے، ان کے ہاں بھی صرف آئین کی عبارات ہی متفق علیہ ہیں، تعبیرات ان میں سے کسی کی متفق علیہ ہوں تو براہ کرم ان کی نشان دہی فرمادیں۔

چار بنیادی حقیقتیں | اس کے علاوہ میری مذکورہ بالا عبارات میں چند امور اور بھی ہیں جن سے صرف نظر کر کے اصل مسائل سے سچیا چھیڑانے کے لیے دوسرے سوالات چھیڑ دیئے ہیں۔ لیکن میں اس راہ گریز کی طرف آپ کو نہ جانے دوں گا جب تک ان امور کے متعلق آپ کوئی متعین بات صاف نہ کہیں۔ یا تو آپ ان کو سیدھی طرح تسلیم کر لیں یا اپنا موقف بدلیے۔ یا پھر محض دعو

سے نہیں بلکہ علمی دلیل سے ان کا انکار کیجیے۔ وہ امور یہ ہیں :

(۱) ”سنتوں کا بہت بڑا حصہ امت میں متفق علیہ ہے۔“ اسلامی نظام حیات کا بنیادی ڈھانچہ جن سنتوں سے بنتا ہے وہ تو قریب قریب سب ہی متفق علیہ ہیں۔ ان کے علاوہ اصول اور کلیاتِ شریعت جن سنتوں پر مبنی ہیں ان میں بھی زیادہ تر اتفاق ہے۔ اختلاف اکثر و بیشتر ان سنتوں میں ہے جن سے جزئی احکام نکلتے ہیں۔ اور وہ بھی سب مختلف فیہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا بھی ایک اچھا خاصہ حصہ ایسا ہے جن پر علماء امت کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔ صرف یہ بات کہ ان اختلافی مسائل کو بحثوں اور مناظروں میں زیادہ اچھالا گیا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ ”سنت“ پوری کی پوری مختلف فیہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سنتوں کے بڑے حصے کو متفق علیہ قرار دینے میں مانع نہیں ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے خمبلی اور زیادہ تر بے علم گروہوں نے کبھی کہیں اور کبھی کہیں اٹھ کر متفق علیہ چیزوں کو بھی اختلافی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے گروہوں نے ایک سنت ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا ہے، بلکہ ان میں سے بعض تحریفِ قرآن تک کے مدعی ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کے چند سرچرے اور کم سواد لوگوں کا وجود امتِ مسلمہ کے بحیثیت مجموعی اتفاق کو باطل نہیں کر سکتا۔ ایسے دو چار سو یا دو چار ہزار آدمیوں کو آخر یہ اجازت کیوں دی جاتے کہ پورے ملک کے لیے جو آئین بن رہا ہو اس میں سے ایک ایسی چیز کو خارج کر دینے کے لیے کھڑے ہو جائیں جسے قرآن کے بعد ساری امت اسلامی قانون کی دوسری بنیاد مانتی ہے اور ہمیشہ سے مانتی رہی ہے ؟

(۲) جزئی احکام سے متعلق جن سنتوں میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بھی یہ نہیں ہے کہ فرد فرد ان میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہو بلکہ ”دنیا کے مختلف حصوں میں گروہوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہو گئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکامِ قرآنی کی کسی ایک تعبیر و تفسیر اور سننِ ثابتہ کے کسی ایک مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کر لیا ہے۔“ مثال کے طور پر اپنے اسی ملک پاکستان کو لے لیجیے جس کے آئین کا مسئلہ

زیر بحث ہے۔ قانون کے معاملہ میں اس ملک کی پوری مسلم آبادی صرف تین بڑے بڑے گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک حنفی۔ دوسرے شیعہ۔ تیسرے اہل حدیث۔ ان میں سے ہر ایک گروہ احکامِ قرآن کی ایک تعبیر اور سننِ ثابتہ کے ایک مجموعہ کو مانتا ہے۔ کیا جمہوری اصول پر ہم آئین کے مسئلے کو اس طرح با سانی حل نہیں کر سکتے کہ شخصی قانون ریپرنٹل لا کی مدد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکامِ قرآن کی وہی تعبیر اور سننِ ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو جسے وہ مانتا ہے، اور ملکی قانون ریپبلک لا، اس تعبیرِ قرآن اور ان سننِ ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے؟

(۳) بجائے خود بھی یہ سوال کہ ”یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنتِ رسول اللہ ہے یا نہیں؟“ حقیقت کوئی لاینحل سوال نہیں ہے۔ جن سنتوں کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہے کہ وہ ثابت ہیں یا نہیں، ان پر علماء کی اہل علم کے وہ بیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال، اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحبِ علم کے لیے بھی مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے۔“

دہم، پھر آئین اور قانون کی اغراض کے لیے اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ ”قرآن کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص، ادارے، یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو، اس کے علم اور اُمرہ کا رکنی حد تک وہی حکم خدا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت ہی ایسا فقہی یا جیسیچر یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکمِ رسول ہے، اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حقیقت میں رسول کا حکم وہی ہے۔“

اب آپ خود ایمان داری کے ساتھ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ یہ امود جو میری محولہ بالا عبارت

میں آپ کے سامنے آتے تھے، ان میں آپ کو اپنے تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب مل گیا تھا یا نہیں؟ اور ان کا سامنا کر کے ان کے متعلق ایک واضح بات نصیاً یا اثباتاً کہنے کے بجائے آپ نے دوسرے سوالات چھیڑنے کی جو کوشش فرماتی ہے اس کی معقول وجہ، جس پر آپ کاغذیہ مطمئن ہو، کیا ہے؟

دوسرے خط کا جواب | اس کے بعد میں آپ کے دوسرے عنایت نامے کو لیتا ہوں اس میں آپ شکایت فرماتے ہیں کہ آپ کے پہلے خط کے جواب میں جن مضامین کی نشاندہی میں نے کی تھی ان سے آپ کو اپنے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا، بلکہ آپ کی الجھن اور بڑھ گئی۔ لیکن اب آپ کے ان سوالات کے متعلق جو تفصیلی گزارشات میں نے پیش کی ہیں انہیں پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ ان میں آپ کو ہر سوال کا ایک متعین جواب ملا ہے یا نہیں، اور ان سے آپ کی الجھن بڑھنے کا اصل سبب آیا ان مضامین میں ہے یا آپ کے اپنے ذہن میں۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو تمہاری دوسری تحریروں سے مختلف ہیں۔ اس کے جواب میں اگر میں یہ عرض کروں کہ براہ کرم میری ان تحریروں کا حوالہ دیجیے اور یہ بتائیے کہ ان میں کیا چیزیں ان مضامین سے مختلف ہیں، تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو گریز کا ایک اور میدان مل جائے گا۔ اس لیے بحث کے دائرے کو زیر بحث مسائل پر مرکوز رکھنے کی خاطر، یہ جواب دینے کے بجائے میں آپ سے عرض کروں گا کہ میری دوسری تحریروں کو چھوڑیے اب جو باتیں میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کے متعلق فرمائیے کہ انہیں آپ قبول کرتے ہیں یا رد، اور اگر رد کرتے ہیں تو اس کے لیے دلیل مستول کیا ہے؟

چار نکات | اس کے بعد آپ مجھے یہ یقین دلا کر کہ اس رسالت سے آپ کا مقصد مناظرہ بازی نہیں بلکہ بات کا سمجھنا ہے، میرے ان مضامین کا عطر چار نکات کی صورت میں نکال کر میرے سامنے پیش فرماتے ہیں اور مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو میں اس بات کی توثیق کروں کہ میرے ان مضامین کا عطر ہی کچھ ہے یا تو یہ کہ آپ نے ان مضامین کا مطالب غلط

سمجھا ہے۔

وہ نکات جو آپ نے عطر کے طور پر ان مضامین سے کشید کیے ہیں ان پر تو میں ابھی ابھی نمبر وار بحث کرتا ہوں، لیکن اس بحث سے پہلے میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اپنے مضامین سے جو نکات میں نے اد پر نکال کر پیش کیے ہیں ان کے مقابلہ میں اپنے اخذ کردہ ان نکات کو رکھ کر آپ خود دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ جو ذہن ان نکات کے بجائے ان نکات کی طرف ملتفت ہوا ہے وہ بات کے سمجھنے کا خواہشمند ہے یا مناظرہ بازی کا مرض۔

نکتہ اولیٰ | آپ کا اخذ کردہ پہلا نکتہ یہ ہے :

”آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم صلعم نے تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنت رسول اللہ کہتے ہیں اس سے یہ دو نتیجے نکلتے ہیں :

۱۔ الف، رسول اللہ صلعم نے اس تئیس سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرماتیں یا عملاً کیں وہ سنت میں داخل نہیں ہیں۔

۲۔ ب، سنت، قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے

اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی نوعیت | یہ خلاصہ جو آپ نے میرے کلام سے نکالا

ہے اس کا پہلا جز ہی غلط ہے۔ میرے ان مضامین میں جن سے آپ یہ خلاصہ نکال رہے

ہیں۔ یہ بات کہاں لکھی ہے کہ ”نبی اکرم نے تئیس برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن کی تشریح

کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنت رسول اللہ کہتے ہیں۔“ میں نے تو اس کے برعکس

یہ کہا ہے کہ حضور کی پیغمبرانہ زندگی کا وہ پورا کام جو آپ نے ۲۳ سال میں انجام دیا، قرآن

کے منشا کی توضیح و تشریح ہے، اور یہ سنت قرآن کے ساتھ مل کر عاکم اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ،

کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے۔ اور یہ کام جو آپ نے آنحضور نے نبی کی حیثیت سے

کیا تھا لہذا اس میں آپ اُسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن۔ اگر آپ دوسروں کی عبارتوں میں خود اپنے خیالات پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تو آپ کے سوال نمبر کے جواب میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر خود دیکھ لیں کہ میں نے کیا کہا تھا اور آپ نے اسے کیا بنا دیا۔

پھر اس سے جو دو نتیجے آپ نے نکالے ہیں وہ دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے میری ان عبارتوں میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈنے کے بجائے ایک نئی بحث کا راستہ تلاش کیا ہے۔ کیونکہ نہ آپ کا پہلا سوال ان مسائل سے متعلق تھا، نہ میں نے اپنے اُن مخصوص مضامین کا حوالہ آپ کو اس لیے دیا تھا کہ آپ ان مسائل کا جواب اُن میں تلاش کریں تاہم میں آپ کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ آپ کے چھڑے ہوئے سوالات کا جواب دینے سے میں نے گریز کیا ہے، اس لیے ان دونوں نتیجوں کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں۔

حضور کی شخصی حیثیت اور غیرانہ حیثیت کا فرق | دال، یہ بات مسلمات شریعت میں سے ہے کہ سنت واجب الاتباع صرف وہی اقوال و افعال رسول ہیں جو آپ نے رسول کی حیثیت سے کیے ہیں شخصی حیثیت سے جو کچھ آپ نے فرمایا یا عمل کیا ہے وہ واجب الاحترام تو ضرور ہے مگر واجب الاتباع نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں باب بیان اقسام علوم انبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے اس پر مختصر مگر بڑی جامع بحث کی ہے صحیح مسلم میں امام مسلم نے ایک پورا باب ہی اس اصول کی وضاحت میں مرتب کیا ہے اور اس کا عنوان یہ رکھا ہے: باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الوائی (یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف اُن ارشادات کی پیروی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی حیثیت سے فرماتے ہیں نہ کہ اُن باتوں کی جو دنیا کے